رسائل و مسائل

تقلید و عدم تقلید

سوال ۱: "تقلید ائمہ اربعہ کو گروہ "اہل حدیث" حرام و شرک بتاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا مقلدین اہل حدیث نہیں ہیں؟ تقلید اصل میں کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے؟"

جواب:۔ اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے، ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ ائمہ کی پیروی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان ائمہ نے اللہ اور رسول کے احکام کی چھان بین کی، آیات قرآنی اور سنت رسول سے معلوم کیا کہ مسلمان کو عبادات اور معاملات میں کس طریقہ پر چلنا چاہیے اور اصول شریعت سے جزئی احکام کا استنباط کیا۔ لہٰذا وہ بجائے خود امر و ناہی نہیں ہیں، نہ بذات خود مطاع اور متبوع ہیں، بلکہ علم نہ رکھنے والے کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ جو شخص خود احکام الٰہی اور سنن نبوی میں نظر بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اصول سے فروع کا استنباط کرنے کا اہل نہ ہو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علماء اور ائمہ میں سے جس پر بھی اسے اعتماد ہو اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اس حیثیت سے ان کی پیروی کرتا ہے تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص ان کو بطور خود امر و ناہی سمجھے یا ان کی اطاعت اس انداز سے کرے جو اصل امر و ناہی کی اطاعت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہو، یعنی ائمہ میں سے کسی کے مقرر کردہ طریقہ سے ہٹنے کو اصل دین سے ہٹ جانے کا ہم معنی سمجھے اور اگر کسی ثابت شدہ حدیث یا صریح آیت قرآنی کے خلاف ان کا کوئی مسئلہ پایا جائے تب بھی وہ اپنے امام ہی کی پیروی پر اصرار کرے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا۔

سوال ۲: فرقہ وہابیہ کا بانی کون تھا؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے؟ ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں؟ کیا علمائے اسلام نے اس کی تردید نہیں کی؟ اگر کی ہے تو کس طریقہ پر؟ آیا اس فرقہ نے اشاعت اسلام میں حصہ لیا ہے یا مخالفت اسلام میں؟

جواب:۔ "وہابی" دراصل کسی فرقہ کا نام نہیں ہے۔ محض طنز اور طعن کے طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے جو یا تو اہل حدیث ہیں، یا محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو ہیں۔ اہل حدیث کا مسلک تو قدیم ہے، ائمہ اربعہ کے زمانہ سے چلا آتا ہے اور یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو، تو وہ دراصل حنبلی طریقہ کے لوگ ہیں، ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کے تھے۔ ہندوستان میں یہ موخر الذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہاں وہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اول اول نہایت اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں اچھے افراد پائے جاتے ہیں، مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہو گئے ہیں جو خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں۔ اور ایسے ہی جاہل خود حنفی کہلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری مناظرہ و مباحثہ اور فرقہ بازی کی

گرمیِ بازار بھی دونوں فریقوں کی برکت ہے۔

سوال ۳۵: کیا کسی حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اٹھے گا؟ کیا یہ حدیث مذکورہ بالا فرقہ پر منطبق ہوتی ہے؟

جواب: نجد یا مشرق کی طرف سے ایک فتنہ کے اٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے، مگر اس کو محمد ابن عبدالوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندھے جوش کا نتیجہ ہے۔ ایک فریق جب دوسرے فریق سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر ہتھیار اس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ خدا اور رسول کو بھی ایک فریقِ جنگ بنانے میں دریغ نہیں کرتا۔

سوال ۳۶: بعض مسائل میں اقوالِ حضرت امام اعظم بظاہر احادیثِ صحیحہ کے خلاف پائے جاتے ہیں۔ جیسے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، شرطِ مصر فی صلوٰۃ الجمعہ وغیرہ۔ تو کیا امام موصوف کے اقوال قرآن و احادیث سے مستنبط ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ احادیث کونسی ہیں؟ کیا وہ عند المحدثین صحیح ہیں؟

جواب: امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام مالک کے مذہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر اہلِ حدیث کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہیں اور ان ائمہ کے پیرووں کی طرف سے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ جو شخص خود علم رکھتا ہو اور جس میں خود اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو وہ فریقین کے درمیان محاکمہ کر سکتا ہے اور اسے حق ہے کہ حدیث سے جس طریقہ کو ثابت پائے اسے اختیار کرے اور جسے ثابت نہ پائے اسے چھوڑ دے۔ لیکن یہ عام اہلِ حدیث جو ان مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں ان کا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا ہے۔ یہ اپنے ائمہ و علماء پر اعتماد کرتے ہیں اور حنفی اپنے ائمہ و علماء پر۔ ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں، نہ یہ احادیث کا اتنا علم اور اصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کر سکیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فاتحہ خلف الامام یا رفع یدین یا آمین بالجہر حدیث سے ثابت ہے اور اس کا خلاف ثابت نہیں ہے، دراصل تقلید کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر۔ لہٰذا ان کے جواب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ البتہ جو علم رکھتے ہیں وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے اس کی رو سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جب امام آواز بلند پڑھ رہا ہو تو مقتدی خاموش رہیں، اور جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی فاتحہ پڑھیں۔ اس طرح کسی حکمِ قرآنی اور کسی حدیث کی خلاف ورزی کا خدشہ نہیں رہتا اور تمام مختلف دلائل کو دیکھ کر یہ ایک متوسط طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک اور امام احمد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جو شخص امام کے پیچھے کسی صورت میں بھی فاتحہ نہیں پڑھتا یا ہر حال میں پڑھتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی، کیونکہ دونوں مسلکوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں اور وہ شخص جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، بلکہ جو حکم اس کے نزدیک دلیل سے ثابت ہے اسی پر عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر وہ الزام نہیں رکھا جا سکتا جو حکمِ شرعی کی بالقصد مخالفت کرنے والے پر رکھا جاتا ہے۔

رہا "رفع یدین" اور "آمین بالجہر"، تو ان کے فعل اور ترک دونوں کی تائید میں دلائل مجھ کو تقریباً مساوی الوزن نظر آتے ہیں۔ اس لیے جو ان افعال کو کرتا ہے وہ بھی حدیث کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے اور جو انھیں ترک کرتا ہے اسے بھی مخالفتِ حدیث کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ شریعت علیہ السلام نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے، اور اسی طرح صحابۂ کرام نے بھی۔ اب ایک شخص جس طریقہ کی بھی پیروی کرتا ہے وہ صاحبِ شریعت ہی کا متبع ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیریت و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، یا اسے اپنے ہی پسندیدہ طریقہ کی طرف تشدد سے کھینچا جائے۔ ہاتھ اٹھانا یا نہ اٹھانا، اور آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا کوئی ایسے اہم فعل نہیں کہ ایک کا التزام اور دوسرے کے ترک کا اہتمام کیا جائے۔

نمازِ جمعہ میں شرطِ مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے خود امام ابوحنیفہ ہی کے استدلال و استنباط کو اس معاملہ میں نہیں سمجھا۔ امام صاحب کا مدعا صرف یہ تھا کہ اقامتِ جمعہ ایسی آبادیوں میں ہو جو اپنے علاقہ کے اندر مرکزی حیثیت رکھتی ہوں اور یہ حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن بعد کے لوگوں نے مصر کا مدلول متعین کرنے میں کھینچ تان کی اور متعدد ایسی شرطیں بڑھا دیں جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ترجمان القرآن میں کی جا چکی ہے۔

سوال ۵: تفہیمات کا مضمون "مسلکِ اعتدال" جماعتِ اہلِ حدیث میں بہت سی غلط فہمیوں کے پھیلنے کا باعث ہو رہا ہے اور منکرینِ حدیث اس کے اقتباسات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس مضمون کو "تفصیلات واشنہ طعن و جرح محدثین" سے خالی کر کے ازسرِ نو شائع کیا جائے[1]۔ یہ بات جماعتی ترقی و استحکام کے لیے مفید ثابت ہو گی۔

جواب: میں اس بات کو صاف صاف واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں موجودہ زمانہ کے اہلِ حدیث اور مقلدین دونوں کا ہم خیال نہیں ہوں اور میرے نزدیک دونوں گروہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اس چیز کے دلائل اگر کبھی فرصت ہوئی تو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ سرِدست صرف اتنی گزارش پر اکتفا کرتا ہوں اور یہی گزارش حضراتِ مقلدین سے بھی کر چکا ہوں کہ براہِ کرم مجھے اپنے مخصوص مسلک کی طرف کھینچنے کی کوشش نہ کریں۔ اسی انتہا پسندی کی بدولت بہت سی خرابیاں واقع ہو چکی ہیں اور اب اگر کوئی شخص اصلاح کرنا چاہتا ہے تو یہی انتہا پسندی بار بار آکر اس کے راستہ میں مزاحم ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ مجھے اپنے طریقہ پر کھینچیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ خود اپنی جگہ بہت ٹھنڈے دل سے تحقیق کریں کہ آیا فی الواقع سنت کی پیروی کی وہی شکل صحیح ہے جو اہلِ حدیث حضرات نے اختیار کی ہے؟

سوال ۶: ذیل میں آپ کے لٹریچر سے چند اقتباسات دربارۂ مسئلۂ تقلید و اجتہاد درج کر کے کچھ استفسارات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سے صرف علمی تحقیق مقصود ہے، بحث مقصود نہیں:۔

۱۔ "تمام مسلمان چاروں فقہوں کو برحق مانتے ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ ایک معاملہ میں ایک ہی طریقہ کی پیروی کی جا سکتی ہے، اس لیے علماء نے طے کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو ان چاروں میں سے کسی ایک ہی کی پیروی کرنی چاہیے" (رسالہ دینیات ص ۱۰۵، طبع دوم)

۲۔ "پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس حدیث کو وہ (محدثین) صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین ان کو خود بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے جائز کمال کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں دو کمزوریاں موجود ہیں، ایک بلحاظ اسناد، ایک بلحاظ تفقہ" (تفہیمات مضمون مسلکِ اعتدال)۔

۳۔ "درایت کا قوی امکان تھا کہ رجال کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں محدثین کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے" (ترجمان جلد ۱۰، عدد ۲ ص ۱۱۰)

۴۔ "رہا فقیہانہ نقطۂ نظر، تو وہ ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں؛

[1] واضح رہے کہ "تفصیلات واشنہ" جو بعض حضرت کو سخت ناگوار ہیں، علامہ ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم سے ماخوذ ہیں۔ م۔

سے اوجھل ہو جاتا تھا۔" ..... "اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ وہ معنی صحیح ہے"۔ ..... "مگر جو لوگ شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر فقیہانہ نقطۂ نظر سے بارہا ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء و مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔ روایت کو بالکلیہ رد کرنا بھی غلطی ہے اور روایات پر ہی اعتماد کرنا بھی غلطی ہے۔ بلکہ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہی وہ مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں یک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں"۔

اب ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر میرے حسب ذیل سوالات پر روشنی ڈالیے :-

ا۔ مسلمان کا چاروں فقہوں کو ماننا کس نص کے ماتحت ہے؟

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کسی کو کسی پر فضیلت ہے؟

ج۔ تفقہ مجتہد اور اسناد حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنیت ہے؟

د۔ محدث و فقیہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اسے نرے محدث یا نرے فقیہ پر فضیلت ہے یا نہیں؟

ر۔ کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابوحنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد کو چھوڑا ہو۔

س۔ کیا یہ قول ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابل قبول ہے، صحیح ہے؟

ص۔ درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسناد صحیح رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے؟

ط۔ کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا و رسول کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جبکہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب :- ا۔ چاروں فقہوں کا برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چاروں فقہی مذاہب کتاب و سنت سے استنباط کرنے کے ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباط مسائل میں کام لیا تھا۔

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ اسناد حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے، وہ کہاں تک قابل اعتبار ہے اور تفقہ مجتہد ایک ایسے شخص کی فیصلہ کن رائے (

ہے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظام شریعت میں کہاں تک نصب (Fit) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (Unfit) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے۔ یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہرحال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلہ پر مقدم ہوتی ہیں۔ (Judgement)

ج۔ نفس مجتہد میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسناد حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہادات اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کر کے حکم شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکم شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہو سکتا ہے اور ایسا شخص نرے محدث یا نرے فقیہ کے مقابلہ میں اصولاً قابل ترجیح ہے، لیکن میرا یہ جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے۔ یعنی کسی شخص خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظ حدیث میں ہے۔

س۔ اس وقت میرے پیش نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے۔ میں اس خط کا جواب سرسری لکھوا رہا ہوں۔

ص۔ ائمہ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب و سنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوئی ہیں ان سے اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

ض۔ درایت سے مراد وہ فہم دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی قدر رکھتی ہے جو درجہ "حذاقت" کا فن طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنھیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنھیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے جو انھیں اللہ کے فضل سے کتاب و سنت میں حاصل ہوئی ہو، کام نہ لیں تو میرے نزدیک گنہ گار ہوں گے۔

میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت، درفقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا معیار بنا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا، جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحب فن کی فنی مہارت کا کوئی نپا تُلا معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضم ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعین کرنے میں غلطی کر کے بھی ویسا ہی مجرم ہو گا۔ حالانکہ شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ... کی حد تک ہی بار ڈالتی ہے، اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

سوال عث:۔ تقلید ائمہ اربعہ کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے، یعنی تقلید کو آپ کسی حد تک جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر جائز سمجھتے ہیں تو کس حد تک؟ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں، آپ ایک وسیع المشرب مقلد ہیں۔

جواب:۔ میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحب علم آدمی کو براہ راست کتاب و سنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس تحقیق میں علمائے سلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہیے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنا چاہیے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب و سنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، پھر جو چیز اس کو حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔ میں نہ مسلک اہل حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں۔ لیکن جماعت میں جو لوگ شریک ہوں، وہ اگر گروہ بندی کے تعصبات سے پاک ہو جائیں اور حق کو اپنے ہی گروہ کے اندر محدود نہ سمجھیں تو وہ جماعت میں رہتے ہوئے اپنے اطمینان کی حد تک حنفی، شافعی یا کسی دوسرے مسلک پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

سوال عش:۔ (سوال علا کا جواب الجواب) دوبارہ عرض ہے کہ "تفہیمات" کا مضمون "مسلک اعتدال" جس میں صحابہ کرام اور محدثین کی باہمی تجریحات کو نقل کیا گیا ہے اور اجتہاد مجتہد اور روایت محدث کو ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس مضمون سے حدیث کی اہمیت کم اور منکرین حدیث کے خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہ رائے نہایت درجہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کے سوالات اگر آپ کے نزدیک بنیادی اہمیت نہیں رکھتے تو جماعت اسلامی کی ابتدائی منزل میں محدثین و فقہاء اور روایت و درایت کے مسئلہ پر قلم اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ اس مسئلہ کے چھیڑ دینے سے غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ بروقت ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے، کیونکہ حدیث کی اہمیت کو کم کرنے والے خیالات جس لٹریچر میں موجود ہوں، اسے پھیلانے میں ہم کیسے حصہ لے سکتے ہیں، حالانکہ نظم جماعت اسے فرد کی قرار دیتا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں مع تنقید اخبارات و رسائل میں شائع کر دی جائیں۔

جواب:۔ فقہی مسائل میں اجتہاد و استنباط کے اصول اور طریقوں کے متعلق غالباً پہلے بھی کبھی کوئی شخص ایسی بات نہیں کہہ سکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور جس پر سب لوگ متفق ہو جائیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو آپ کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان اختلافات کے لیے کافی گنجائش خود کتاب اللہ اور ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے سلف صالحین کے درمیان ہر دور میں اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر کیا ان اختلافات کا منشا یہی تھا کہ اصل دین کی دعوت اور اقامت کے لیے بھی مسلمان کبھی ایک جماعت نہ بن سکیں؟ اور اگر صدیوں میں کوئی ایسی جماعت کبھی بنے تو فقہی مسائل پر کلام کرنا چھوڑ دیا جائے؟ یا نہیں تو پھر سارے فقہی اختلافات کو پہلے صاف کیا جائے؟ اگر آپ کا نقطۂ نظر یہی ہے تو مجھے اس پر افسوس ہے اور سوائے اس کے کہ میں اس کو بدقسمتی سمجھوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے تو پھر براہ کرم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ ہماری یہ جماعت اصل دین کی دعوت و اقامت کے لیے کھڑی ہوئی ہے اور اس کام میں تمام ان فقہی مسالک کے آدمیوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے جن کے اصول اور طریقوں کے لیے قرآن و حدیث میں بنیادیں موجود ہیں۔ لیکن یہ اجتماع اسی طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کو مسائل فقہیہ میں اصولی گنجائشوں کی حد تک تحقیق کی آزادی حاصل رہے، اور یہ آزادیٔ تحقیق ان مختلف المسلک لوگوں کے درمیان ایسی نزاع کی موجب نہ بنے جو نفس اجتماع برائے اقامت دین میں مانع ہو۔ اسی وجہ سے

میں اس بحث کو ٹال رہا ہوں جسے آپ لوگ بار بار چھیڑ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ظنیات کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑتے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کے لیے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے، وہی ذہنیت بار بار برسر کار آئے چلی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام دین کی اصل و اساس بس وہی امور ہیں جو آپ معرض بحث میں لاتے ہیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان چیزوں پر بحث کرنے کے لیے اتنا وقت حاصل نہیں ہے جتنا آپ حضرات کو حاصل ہے، اس لیے مختصر مختصر جوابات اپنے خطوط میں دیتا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا منشا یہی ہے کہ میں اور سب کام چھوڑ کر انھیں بحثوں میں الجھ جاؤں تو بسم اللہ، ایک اور مفصل مضمون روایت اور اجتہاد کی توضیح میں لکھ دوں گا، مگر یقیناً اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ آپ حضرات کو اطمینان ہو جائے، بلکہ ہو گا یہ کہ جماعت کے اندر اور باہر کے تمام اہل حدیث حضرات میرے ساتھ اس بحث میں الجھ جائیں گے اور ہمارے لیے ایک نصب العین پر جمع ہو کر کام کرنا محال ہو جائے گا۔ پھر یہ فساد اس مقام پر بھی ختم نہیں ہو گا، بلکہ جب ان بحثوں کا دروازہ کھلے گا تو میرے وہ مضامین بھی زیر بحث آ جائیں گے جن پر کچھ حنفی حضرات آپ لوگوں کی طرح بگڑے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے محاذ پر ویسی ہی ایک اور جنگ شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ ایک مرتبہ پھر مجھے سوچ کر لکھئے کہ کیا یہی آپ کا منشا ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر یہ باتیں بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں تو جماعت کی ابتدائی زندگی میں ان پر قلم اٹھانا نامناسب تھا، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب تک میں نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو، اور اگر میں یہ فیصلہ کر لوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار ہو تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔ مگر یقین کیجیے کہ اس معاملہ میں جتنا ناکام میں ہوا ہوں، اس سے شاید بہت زیادہ ناکام آپ حضرات ثابت ہوں گے۔ اگر آپ اس دعوت کے لیے کام کرنے کھڑے ہوں تو غالباً چند صفحے بھی ایسے نہ لکھ سکیں جو اہل حدیث حضرات کے سوا کسی دوسرے گروہ کو ناگوار ہوئے بغیر رہ سکتے ہوں۔ پس خوب سمجھ لیجیے کہ اصل چیز ان مباحث سے پرہیز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو کچھ لکھے یا کہے وہ معقولیت کو برقرار رکھتے ہوئے، حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، شان تحقیق کے ساتھ لکھے، اور دوسرے لوگ جو اس کے سننے والے یا پڑھنے والے ہیں، ان کے اندر کچھ قوت تحمل، کچھ وسعت قلب، کچھ رواداری اور کچھ اصول و فروع کی تمیز موجود ہو۔

آپ کا یہ خیال تو بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ جب لٹریچر میں کوئی وجہ اختلاف موجود ہے تو اسے کیسے پھیلایا جا سکتا ہے۔ ذرا مجھے کوئی ایسا لٹریچر بتا دیجیے جس میں تمام چیزیں تمام لوگوں کے منشا کے مطابق ہی ہوں۔ موجودہ دور میں نہیں، متقدمین کے دور میں ہی بتلا دیجیے۔

اگر اس بحث کا فیصلہ اس طرح ہو سکے کہ آپ یا آپ کے ہم خیال حضرات میں سے کوئی صاحب میری تحریروں پر ایک تنقید لکھ کر شائع کر دیں تو میں اس کو دل سے پسند کروں گا اور اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی نہ لکھوں گا تا کہ کسی طرح اس قضیہ کا خاتمہ تو ہو۔

سوال ۹ :- قرآن کے بعد احادیث نبویہ کو دینی و شرعی حجت ماننے یا نہ ماننے میں ہمارے اہل فکر و نظر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں تفریط تو یہ ہے کہ ذخیرہ احادیث کو تاریخی روایات کی حیثیت دی جائے اور افراط یہ ہے کہ احادیث صحاح میں "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے الفاظ سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہو اسے کلیۃً رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حدیث سمجھ لیا جائے اور اس پر دین و اعتقاد کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ میں اپنی معلومات کی کمی اور فکر و نظر کی کوتاہی کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نقطۂ اعتدال نہیں پا سکا۔ براہ کرم آپ ہی رہنمائی فرمائیے اور ان شبہات کو صاف کر دیجیے۔

کیا احادیث کی تحقیق و تنقیح اور راویوں کے حالات کی تفتیش کا کام اگلے محققین پر ختم ہو گیا؟ اگر جواب اثبات

ہیں ہے تو اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اور پھر اس کے کیا معنی کہ صحیح بخاری تک میں ایسی حدیثیں موجود ہیں جو نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں محل اعتراض ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا تین مرتبہ جھوٹ بولنا، حضرت موسیٰ کا ملک الموت کی آنکھ پر گھونسہ مارنا وغیرہ روایات کو ملاحظہ کیجیے۔

نیز اگر جواب نفی میں ہو تو بتلائیے کیا وجہ ہے کہ اب تک صحیح اور غلط احادیث کو چھانٹ دینے کا فریضہ متاخرین علمائے اسلام نے انجام نہیں دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مشتبہ روایات پر وارد ہونے والے اعتراضات تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جواب:- میں اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ احادیث کی تنقید و تحقیق و ترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوا ہے وہ اگرچہ نہایت قابل قدر ہے مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علماء نے پھر یہ کام کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دیا ہو ان سے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھانٹ پرکھ کا کام کیوں نہیں کیا۔

سوال ۳:- ہمارے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہو گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم و فضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حقدار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر طحطاوی میں ایک بڑے صاحب کمال فقیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے:

"المنتقل من مذھب الی مذھب باجتھاد وبرھان آثم یستوجب التعزیر"

جواب:- میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز، اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔ رہا طحطاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے، تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو میں اس کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہش نفس کی بنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بنا پر۔

سوال ۴:- ایسا اجماع جو کسی صحیح حدیث پر مبنی ہو واقعی شرعی حجت ہے اور ایسے اجماع کا منکر یقیناً کافر ہے۔ لیکن ایسا اجماع جو علماء نے کسی ایسے مقصد پر کر لیا ہو جو مخبر صادق کے لفظوں سے صراحۃً ثابت ہو یا کسی ایسی حقیقت سے تعلق رکھتا ہو جس کی تصریح شارع علیہ السلام نے نہ کی ہو اور اسے مصلحتاً مجمل ہی رہنے دیا ہو کیا یہ بھی شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے؟

جواب:- اجماع کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ اجماع سے مراد امت کا متفقہ فیصلہ ہے، اور یہ متفقہ فیصلہ لامحالہ دو ہی قسم کے امور سے متعلق ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کے امور وہ جو احکام شرعی میں سے ہوں۔ دوسری قسم کے امور وہ جو دنیوی تدابیر کے قبیل سے ہوں۔ پہلی قسم کے امور میں سے کسی امر میں اگر امت متفق ہو کر کسی حکم منصوص کی تشریح کرے اور وہ تشریح کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کو پیش نظر رکھ کر نہ کی گئی ہو، بلکہ اصولاً شارع کا منشا یا سنت کا طریقہ متعین کیا گیا ہو تو ایسا اجماع یقیناً حجت ہے اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے۔ اور اگر کسی مصلحت وقتی کو ملحوظ رکھ کر کسی حکم کی تشریح کی گئی ہو تو ایسے اجماع کی پابندی اس وقت تک امت پر لازم ہوگی جس وقت تک وہ مصلحت باقی ہے۔ حالات بدل جانے کے بعد اس کی پابندی لازم نہیں رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی اجماع کسی حکم شرعی کی تشریح

کے متعلق نہ ہو، بلکہ کسی تدبیر دنیوی کے متعلق امت نے متفق ہو کر طے کر لیا ہو کہ اس طرح عمل کیا جائے گا تو اگر اصولِ شریعت میں اس طرزِ عمل کے لیے کوئی گنجائش موجود ہو تو ایسا اجماع واجب العمل ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ نیز یہ کہ ایسا اجماع کبھی دائمی اور ابدی وجوب کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک زمانہ کے مسلمان یا ایک ملک یا ایک قوم کے مسلمان کسی تدبیر یا کسی کام پر اتفاق کریں اور دوسرے زمانہ میں اسی قوم یا اسی ملک کے لوگ کسی اور امر پر اتفاق کر لیں۔ یہ ملکی اور قومی اور زمانی اجماع صرف ایک خاص زمانے اور خاص ملک یا قوم کے مسلمانوں ہی کے لیے واجب العمل ہو سکتے ہیں۔ بعد کے زمانے والوں یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو اگر اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہو تو یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ چونکہ پہلے فلاں خاص امر پر اجماع ہو چکا ہے یا فلاں ملک میں اس پر اتفاق ہو چکا ہے اس لیے اب اس کے بارے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔

سرکاری نرخ بندی پر چند سوالات

سوال ۱:۔ حکومت ایک جماعت کو کچھ اشیاء ارزاں قیمت پر مہیا کرتی ہے۔ دوسری جماعت کے افراد اس رعایت سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ پھر کیا موخر الذکر طبقہ کا فرد پہلی جماعت کے کسی فرد کے ذریعہ حکومت کی اس رعایت سے استفادہ کر سکتا ہے؟ مثلاً مردت یا جائے رعایت پانے والی جماعت کا کوئی فرد محروم رعایت جماعت کے کسی فرد کو کوئی چیز اپنے نام سے کم قیمت پر خرید کر دے سکتا ہے؟ یا اس کی کسی پرانی چیز کو نئی چیز سے بدلانے کا شرعاً جواز ہے؟

جواب:۔ آپ نے جس معاملہ کا یک جا ذکر کر دیا ہے وہ دراصل دو مختلف پہلو رکھتا ہے جن کا حکم مختلف ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی خاص گروہ کے لیے نرخوں میں جو رعایت کی گئی ہے اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ یہ بات حکومت کے قانون کی رو سے ناجائز ہو تو ہو، اخلاقاً اس میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت اس وقت قیمتوں کا چڑھاؤ کسی اصلی گرانی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ محض ایک مصنوعی چڑھاؤ ہے جو حکومت اور ملک کے سرمایہ دار طبقہ نے بالکل ارادۃً پیدا کیا ہے۔ عام باشندے اس گرانی سے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت کر دیے گئے ہیں۔ بعض خاص گروہوں کے ساتھ جو رعایت کی جا رہی ہے، درحقیقت تمام باشندگانِ ملک اس کے مستحق تھے لیکن حکومت نے ملک میں عام گرانی پیدا کر کے اپنی خاص خدمات انجام دینے والوں کے لیے کچھ رعایتیں اس غرض سے کی ہیں کہ ان رعایتوں کے لالچ سے لوگوں میں ان خدمات کی طرف میلان پیدا ہو اور جن خادموں کے ساتھ یہ رعایتیں کی گئی ہیں وہ حکومت کے احسان مند ہوں۔ یہ غرض بجائے خود ناجائز ہے، اس لیے اگر کوئی اس بندش میں رخنہ پیدا کرے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کا مجرم ہوگا۔ تاہم زبردستی کا قانون الگ ایک چیز ہے جس کے لیے کسی اخلاقی بنیاد کی ضرورت نہیں۔

رہی یہ صورت کہ پرانی چیز دے کر کسی خفیہ طریقے سے نئی چیز اس کے بدلے حاصل کی جائے تو یہ یقیناً اخلاق کے خلاف ہے۔

سوال ۲:۔ آج کل کنٹرول کا زمانہ ہے مگر کوئی مال دکاندار کو کنٹرول نرخ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ وہ مجبوراً چور بازار (Black-Market) سے مال خرید کر گاہکوں کو سپلائی کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے مال کو کنٹرول ریٹ پر بیچنے میں اُسے خسارہ ہوتا ہے۔ لامحالہ وہ زیادہ نرخ لگاتا ہے۔ مگر بعض لوگ اس خرید و فروخت کو بے ایمانی اور فریب قرار دیتے ہیں اور پولیس بھی اس پر گرفت کرتی ہے۔ اس بات میں شریعت کا کیا حکم ہے

جواب:۔ اخلاقی حیثیت سے حکومتوں کو تسعیر (Price control) کرنے کا اُس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ

وہ اپنی مقرر کردہ قیمتوں پر لوگوں کو مال دلوانے کا انتظام نہ کریں۔ اس چیز کا انتظام کیے بغیر محض اشیاء کے نرخ مقرر کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے پاس اشیاء کے ذخائر ہوں وہ ان کو چھپا دیں اور یا تو چیزیں بیچیں ہی نہیں یا قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے خفیہ طور پر زائد قیمتوں پر بیچیں۔ جو حکومت اس نتیجہ سے محض عقلاً ہی نہیں بلکہ از روئے تجربہ بھی واقف ہو اور پھر نرخ مقرر کرنے کی پالیسی اختیار کرے اس کو اخلاقاً یہ مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ لوگ اس کے مقرر کردہ نرخوں کی پابندی کریں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ عام خریدار، خوردہ فروش اور چھوٹے تاجر بڑے صاحب ذخیرہ لوگوں سے اگر حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر مال خریدنا چاہیں تو انھیں کچھ نہیں مل سکتا اور اگر چور بازار سے زائد قیمتوں پر مال خریدیں تو ان کے لیے یہ غیر ممکن ہے کہ اس مال کو حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر آگے بیچ سکیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی ضرورت پوری کرنے یا اپنی روزی کمانے کے لیے چور بازار سے مال خریدتا ہے اور زائد نرخوں پر اسے فروخت کرتا ہے تو وہ کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اگر اسے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے تو یہ حکومت کا مزید ایک ظلم ہوگا۔ ہمارے رفقا میں سے جو لوگ تاجر ہیں انھیں اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کو چاہیے کہ کچہری میں وکیل کے بغیر حاضر ہو کر اس پوزیشن کو صاف صاف مجسٹریٹ کے سامنے بیان کر دیں اور کہہ دیں کہ اگر ایسی صورت حال میں بھی آپ لوگوں کی حسّ انصاف ہمیں مجرم اور قابل سزا سمجھتی ہے تو آپ ضرور سزا دے دیں، ہم آپ کی ان عدالتوں سے بالاتر ایک عدالت کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا اور آپ کا انصاف ضرور کرے گی۔

"تسعیر" کے سلسلہ میں چونکہ ذکر آ گیا ہے اس لیے میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں اسلام کی پالیسی کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ قیمتیں مقرر فرما دیجیے، لیکن آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اپنے خدا سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ میرے اوپر تم میں سے کسی کے مال یا جان کا دعویٰ نہ ہو۔ پھر آپ نے مسلسل اپنے خطبوں میں اور اپنی گفتگوؤں میں یہ فرمانا شروع کیا کہ ضروریات زندگی کو بازار میں لانے والا خدا سے رزق اور رحمت پاتا ہے اور ان کو روک رکھنے والا خدا کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے، اور یہ کہ جس نے چالیس روز تک غلہ روک کر رکھا تاکہ قیمتیں چڑھیں اور وہ ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو اللہ کا اس سے اور اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ کہ جس شخص نے چالیس دن غلہ روک رکھا، پھر اگر وہ سارا غلہ خیرات بھی کر دے تو یہ اس گناہ کی تلافی نہیں کرتا جو اس نے ۴۰ دن غلہ روک کر کیا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم احتکار کے خلاف مسلسل تبلیغ و تلقین فرماتے رہے، یہاں تک کہ تاجروں کے نفس کی اصلاح خود بخود ہو گئی اور جو ذخیرے روکے گئے تھے وہ سب بازار میں آ گئے۔ یہ شان ہے اس حاکم کی جس کی حکومت اخلاق فاضلہ کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس کی اصل قوت پولیس اور عدالت اور آرڈیننس نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانوں کے قلب و روح کی تہوں میں برائی کی جڑوں کا استیصال کرتا ہے، نیتوں کی اصلاح کرتا ہے اور لوگوں سے رضاکارانہ اپنے ان احکام کی پابندی کراتا ہے جو صحیح اخلاقی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے یہ حکام جن کی اپنی نیتیں درست نہیں ہیں، جن کے اپنے اخلاق فاسد ہیں اور جن کی کرسی کے لیے جابرانہ تسلط کے سوا اور کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، اگر کبھی انھیں ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جیسے آج کل درپیش ہیں تو یہ سارا کام جبر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اخلاق کی اصلاح کرنے کے بجائے فساد اخلاق کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتے ہیں۔

اسلامی ریاست اور ذمی رعایا

سوال: میں ہندو مہاسبھا کا ورکر ہوں۔ سال گزشتہ صوبہ ..... کی ہندو سبھا کا پروپگنڈا سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی

میں جناب کے نام سے شناسا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و سوم، اسلام کا نظریہ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، سلامتی کا راستہ وغیرہ دیکھی ہیں، جن کے مطالعہ سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطعاً بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہوگئی ہوتی تو ہندو مسلم مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومت الٰہیہ کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس میں زندگی بسر کرنا قابل فخر ہو سکتا ہے۔ مگر چند امور دریافت طلب ہیں۔ خط و کتابت کے علاوہ ضرورت ہوگی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومت الٰہیہ کے اندر کس درجہ میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہل کتاب کے حقوق دیے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہل کتاب اور ذمی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر عربی حملہ کی تاریخ کا علم ہے، محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کے ہندوؤں کو اہل کتاب کے حقوق دیے تھے۔ امید ہے کہ آپ اس معاملہ میں تفصیلی طور پر اظہار خیال کریں گے۔

نیز یہ بھی فرمایئے کہ اہل کتاب اور ذمی کے حقوق میں کیا فرق ہے؟ کیا وہ ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار ہوں گے جو کہ آپ حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ کیا قرآن کے فوجداری اور دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا ہندوؤں کا قومی قانون (Personal Low) ہندوؤں پر نافذ ہوگا یا نہیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ ہندو اپنے قانون وراثت، مشترکہ فیملی سسٹم اور متبنّیٰ وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منو شاستر) کے مطابق زندگی بسر کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محض ایک متلاشی حق کی حیثیت سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جواب:۔ میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر کیے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ کو پیچیدہ اور ناقابل حل حد تک پیچیدہ بنا دینے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اصول حق اور راستی کی بنیادوں پر مسائل زندگی کو حل کرنے کے بجائے شخصی، خاندانی، طبقاتی، نسلی اور قومی بنیادوں پر انھیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور اس بدقسمتی میں ہم آپ سب برابر کے شریک ہیں، کوئی بھی فائدے میں نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اگر حکومت الٰہیہ قائم ہو تو اس کی حیثیت "ایک قوم کی حکومت دوسری قوم یا اقوام پر" کی نہ ہوگی، بلکہ دراصل وہ ایک اصول کی حکومت ہوگی اور اس کو چلانے کی ذمہ داری ظاہر بات ہے کہ وہی لوگ اٹھا سکیں گے جو اس اصول کو ماننے والے ہوں۔ دوسرے لوگ جو اس اصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں، ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر "اہل ذمہ" کی حیثیت حاصل ہوگی، یعنی جن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲۔ "اہل کتاب" اور "عام اہل ذمہ" کے درمیان اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ ذمیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا، البتہ اصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذمی دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدہ کے ذمہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدہ میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذمی، تو ان کا ذمی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان اور مال اور آبرو کی کریں گے۔ ان کے شہری حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہو گی جو مسلمان کے خون کی ہے۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم ہرگز ان پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔

ذمیوں کے متعلق قانون کی تفصیلات سے ان شاء اللہ ہم ایک کتاب کی شکل میں الگ شائع کریں گے۔

۴۔ جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لا کا تعلق ہے وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جزء ہے، اس لیے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح و طلاق اور قوانین وراثت و تبنیت کو اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے ٹکراتے ہوں، ان پر جاری کرے گی، اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لا کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا براثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تب بھی ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے، کیونکہ یہ اخلاق انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (Criminal Law) سے بھی ٹکراتی ہے، جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون (Law of the Land) بھی ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے امور کو قیاس کر سکتے ہیں۔

۵۔ آپ کا یہ سوال کہ آیا ذمی ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں، مثلاً پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومت الٰہیہ میں دیں گے؟ ــــ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اصولی غیر قومی حکومت (Ideological-Non National state) کی صحیح حیثیت آپ نے اس میں ملحوظ نہیں رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ "پاکستان اور ہندوستان" کی ذہنیت اس میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اول میں تصریح کر چکا ہوں، اصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اس اصول پر یقین رکھتے ہوں۔ وہی اس کی اسپرٹ سمجھ سکتے ہیں، انہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین و ایمان سمجھتے ہوئے اس "ریاست" کے کام کو چلائیں گے اور انہی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لیے اگر ضرورت پڑے تو میدان جنگ میں قربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اصول پر ایمان نہیں رکھتے، اگر حکومت میں شریک کیے بھی جائیں گے تو نہ وہ اس کی

اصولی اور اخلاقی روح کو سمجھ سکیں گے، نہ اس روح کے مطابق کام کر سکیں گے اور نہ اُن کے اندر ان اصولوں کے لیے اخلاص ہو گا جن پر اس اصولی حکومت کی عمارت قائم ہو گی۔ سول محکموں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر طائر مانہ ذہنیت کارفرما ہو گی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور اپنی قابلیتیں بیچیں گے۔ اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرائے کے سپاہیوں (Marcenaries) جیسی ہو گی اور وہ ان اخلاقی مطالبات کو پورا نہ کر سکیں گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے۔ اس لیے اصولاً اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہل ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے برعکس فوجی حفاظت کا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہل ذمہ سے صرف جزیہ لینے پر اکتفا کرتی ہے (جزیہ اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہل ذمہ سے نہیں لیے جا سکتے)۔ رہے سول محکمے تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین و تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں، بہرحال اہل ذمہ کو نہیں دیے جا سکتے۔ البتہ محض کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو اسمبلی شوریٰ کے لیے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہل ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کونسلیں بنا دی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی دیکھ بھال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی نظم و نسق کے متعلق اپنی خواہشات، اپنی ضروریات اور شکایات کا اظہار بھی کر سکیں گی جن کا پورا پورا لحاظ اسلامی مجلس شوریٰ (assembly) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ جو بھی اس کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے، خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ، لیکن جو اس کے اصول کو تسلیم نہ کرے وہ خواہ مسلم زادہ ہی کیوں نہ ہو، حکومت کی محافظت (Protection) سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ "کیا تم ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرو گے جو حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو دو گے"، یہ دراصل پاکستانیوں سے کیا جانا چاہیے نہ کہ ہم سے۔ اگر آپ یہ سوال ہم سے کرتے ہیں تو ہم اس کا جواب اصولی حیثیت سے دیں گے اور وہ یہ ہے کہ جہاں حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اصولاً دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں: یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو، یا پھر ایسی حکومت جو ہندو قومیت کی بنیاد پر ہو۔ پہلی صورت میں آپ کے لیے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے حقوق حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو ملیں گے ویسے ہی حقوق ہم "رام راج" میں مسلمانوں کو دیدیں گے، بلکہ آپ کو اس معاملہ میں اگر کوئی رہنمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم و کاست اسی پر عمل کریں، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملہ سے بہتر ہو گا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پالیں گے، اور بعید نہیں کہ ایک روز ہماری حکومت الٰہیہ آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو ظاہر ہے کہ دیر یا سویر نتیجہ بھی برعکس نکل کر ہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت ہندو قومیت کی بنیاد پر قائم ہو تو اس صورت میں بھی آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جمہوری (Democratic) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں، یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (Subject Nation) کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔ ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں، بہرحال آپ کے برتاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست اُن اصولوں میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمیوں سے معاملہ کرنے کے لیے قرآن و حدیث میں مقرر کر دیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ اپنی قومی ریاست میں مسلمانوں کا

قتل عام بھی کر دیں اور ایک مسلمان بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑیں تب بھی ان کے انتقام میں اسلامی ریاست کے کسی ذمی کا بال بیکا نہ کیا جائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر آپ ہندو ریاست میں صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر ان چیف، غرض تمام کلیدی مناصب مسلمانوں کو دے دیں تب بھی اس کے جواب میں کوئی ایک ذمی بھی اسلامی حکومت کے کسی محکمہ کا نگراں (Director) نہ مقرر کیا جائے گا اور نہ کسی ذمی کو اسلامی فوج میں بھرتی کیا جائے گا۔

قرآن اور عربی زبان

سوال ۱:۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ پڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ ہماری اور ہمارے آباؤ اجداد کی زبان عربی نہیں تھی۔ پھر قرآن کے عربی ہونے پر ہم کیوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے مکلف ہیں؟

جواب ۱:۔ جو نبی الگ الگ قوموں کے لیے آتے رہے ان کی دعوت تو اسی قوم کی زبان میں ہوتی تھی جس قوم میں وہ آئے تھے، لیکن جو نبی تمام قوموں کے لیے آئے اس کے لیے بھی بہرحال یہ ناگزیر ہے کہ وہ پہلے اس قوم میں دعوت و تبلیغ کا کام کرے جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور پھر اس قوم کو مسلمان بنانے کے بعد دنیا کی باقی دوسری قوموں میں تبلیغ کرنے کے لیے اسے ذریعہ بنائے۔ اس کے سوا ایک عالمگیر نبی کے لیے تبلیغ کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟

سوال ۲: ایک سکھ دوست کو مطالعہ کے لیے کچھ لٹریچر دیا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران میں موصوف کی طرف سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ تم کہتے ہو کہ خدا پیغمبروں کے کلام کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کے لیے ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی بھیجتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا اہم نظام ایک ایسی زبان میں کیوں پیش کیا گیا ہے جو ایک خاص خطۂ ارض میں بولی جاتی ہے؟ کیوں نہ اس خدا نے جو قادرِ مطلق کہلاتا ہے ایک عالمگیر زبان بنا دی، تاکہ ہر کوئی اس کے کلام سے یکساں مستفید ہوتا؟ عربی قرآن شریف تو صرف عربوں ہی کے لیے مفید ہے!۔

جواب ۲:۔ آپ کے جن سکھ دوست نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اگر اپنے تخیل کو تھوڑی حرکت اور دیتے تو اس سے بڑھ کر وہ یہ سوال بھی کر سکتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ براہِ راست ایک ایک انسان کے پاس خدا نے کیوں نہ بھیجا؟ کیونکہ جب وہ قادرِ مطلق ہے تو ایسا بھی کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں فرمایا ہے جس سے دنیا کے اس انتظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئے جو اپنی فطری رفتار پر چل رہا ہے۔ انسانوں میں زبان کا اختلاف اور اس بنا پر نوعِ انسانی میں چھوٹے اور بڑے حلقے بن جانا ایک فطری چیز ہے جو خود اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اگر قادرِ مطلق ہے تو اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی سلطنت کا انتظام اٹل قوانین پر چل رہا ہے، انھیں قوانین کے ماتحت قوموں کی زبانوں اور ان کی روایات میں تنوع نمودار ہوتا ہے۔ اگر اسپرانٹو کی قسم کی کوئی زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی جاتی تب بھی وہ نہ تو قوموں کی مادری زبان بن سکتی تھی نہ اس کے ادب سے قلوب متاثر ہو سکتے تھے اور نہ لوگ اس کی ادبی نزاکتوں کو محسوس (appreciate) کر سکتے تھے، الا یہ کہ قوموں کی مادری زبانوں کو اللہ تعالیٰ فوق الفطری طریقہ سے مٹا دیتا اور فوق الفطری طریقہ ہی سے اس اسپرانٹو کو زبردستی تمام قوموں کی زبان

سلسلہ یہ اعتراض بالکل اسی نوعیت کا ہے جیسے عہدِ قدیم کے کفار و مشرکین کہتے تھے کہ نبی اگر بھیجا ہے تو اس کے ساتھ بڑے بڑے خزانے کیوں نہیں ہیں کہ آرام کی زندگی گزارے اور اپنی تحریک کو خوب پھیلا سکے۔ یا نبی انسان کیوں ہے اور انسانی ضروریات و کمزوریاں کیوں رکھتا ہے، اسے کوئی فرشتہ ہونا چاہیے اور فوق الفطری قوتوں سے اپنی تحریک کو پھیلانا چاہیے۔

بنا دیتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک کام اس کے دوسرے کام کو مٹانے کے لیے نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زبانوں کے سابق فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا کام انجام دیا ہے۔

یہ اعتراض کہ عربی میں قرآن شریف صرف عربوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے، اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا جبکہ اللہ نے صرف کتاب نازل کی ہوتی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب کے ساتھ رہنما بھی پیدا کیا۔ اس رہنما نے پہلے انسانوں کی ایک قوم کو جس کی زبان میں کتاب نازل ہوئی تھی، خطاب فرمایا اور اس قوم کو تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعے اس نظام کے سانچے میں ڈھال دیا جو کتاب کے منشاء کے مطابق تھا۔ پھر اس قوم کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو نبی کی قائم مقام بن کر اسی طرح خطاب کرے اور اسی طرح تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے جس میں پہلے وہ خود ڈھالی گئی تھی پھر جو قومیں اس طریقہ سے اس اثر کو قبول کرتی جائیں وہ دوسری قوموں کے لیے یہی خدمت انجام دیں۔ یہ اس تعلیم کو عام کرنے کی فطری راہ تھی اور دنیا میں جس تحریک نے بھی عالمگیر کام انجام دیا ہے، خواہ وہ خدا پرستانہ ہو یا کسی دوسری نوعیت کی، بہر حال اس نے فطرتاً یہی راہ اختیار کی ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی کتاب صرف اسی قوم کے لیے مفید ہے جس کی زبان میں وہ لکھی گئی ہو تو پھر دنیا کی علمی تاریخ کو غلط تسلیم کرنا پڑیگا۔ پھر تو انسانی تصنیفات کو بھی زبانوں کے لحاظ سے قوموں کے لیے مخصوص کر دینا ہو گا، ترجمہ اور بین الاقوامی تبلیغ کے تمام دوسرے ذرائع کے نفع کا انکار کر دینا ہو گا، حالانکہ یہی چیزیں ہیں جن کے بل پر بڑی بڑی تحریکوں کی دعوت اور بڑی بڑی انقلابی شخصیتوں کے پیغام دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتے رہتے ہیں۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ محض عربی زبان میں ہونے کی وجہ کر اسے عرب قوم کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا جائے۔

اگر کوئی شخص اس چیز سے مطمئن نہ ہو اور برابر اپنے اس اصرار پر قائم رہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اسی طرح اللہ کو کام کرنا چاہیے تھا تو اُسے اپنی رائے پر جمے رہنے کا اختیار حاصل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسے ایسے سوالات کو سد راہ بنا کر اگر ایک شخص ایک کتاب یا ایک پیغام سے استفادہ نہیں کرنا چاہتا تو نقصان کس کا ہے؟ یہ روِش طالبانِ حق و صداقت کا نہیں ہوتا۔ وہ تو جگہ جگہ ٹوہ لگاتے پھرتے ہیں کہ سچائی کی روشنی کہاں ہے، اور کہاں سے وہ ملتی ہے۔ اگر آدمی دنیا کی ہر کتاب، ہر پیغام اور ہر تعلیم کے مقابلہ میں دل و دماغ پر کسی نہ کسی قسم کا قفل چڑھالے تو پھر وہ ایک قدم بھی زندگی کی سیدھی راہ پر نہیں چل سکتا۔

رموز نبوت

سوال ۱:۔ آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام کے رکوع ۹ سے تعلق رکھنے والے ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ:۔

"وہ (حضرت ابراہیم) ھٰذَا رَبِّی کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے، کیونکہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار ان کا نہیں، بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔" (ترجمان جلد ۲۳، عدد ۵، ۶ صفحہ ۴۴)

سوال یہ ہے کہ اگر نبوت وہبی ہوتی تو حضرت ابراہیم کو عام انسانوں کی طرح خدا کے پالنے یا نہ ہونے کے مسئلے میں شک اور تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوت ایک

کسی معاملہ ہوا۔ اور ایک فلاسفر اور نبی کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔

جواب :۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا اور اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ نیز آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا اور فلسفیانہ استدلال سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا، ان دونوں میں بھی فرق نہیں کیا گیا۔

انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے مختلف نہیں تھی اور نہ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعہ حصولِ علم ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ وہ بھی انھی ذرائع سے، جو عام انسانوں کو حاصل ہیں، تحقیق و جستجو کی راہ طے کرتے تھے اور ایمان بالغیب کے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتے تھے جس کے بعد صرف ایمان بالشہادۃ کا مرتبہ باقی رہ جاتا تھا۔ پھر یہ آخری مرتبۂ ایمان نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد ان کو حاصل ہوتا تھا۔ اسی سے ان کی فضیلت عام انسانوں پر ثابت ہوتی ہے، ورنہ اگر ان کا ایمان بالغیب بھی اسی طرح وہبی قرار دیا جائے جس طرح کہ وحی ایک وہبی چیز ہے تو ان کے لیے کوئی فضل باقی نہیں رہتا۔

جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ قرآن مجید میں آیا ہے، اگر اس کے ماقبل اور مابعد کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو وہاں مقصودِ بیان ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام انسانوں کو یہ بتایا جائے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق کس طرح حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

سوال ۱۲ :۔ یہ امر مسلّم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں، مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی، جیسے لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔

جواب :۔ نبی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی دل تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور پھر اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو غلطی ہوئی تھی وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبلِ نبوت نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بہت بڑا گناہ کیا تھا کہ ایک انسان کو قتل کر دیا، چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ مجھ سے یہ فعل اس زمانہ میں سرزد ہوا تھا جبکہ مجھ پر راہ ہدایت نہ کھلی تھی۔ مختصر یہ کہ نبی فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ انسان ہوتا ہے اور انسان کی معصومیت کا مفہوم فرشتوں کی معصومیت سے بالکل جداگانہ ہے۔

مستقبل کا خاکہ تعمیر

سوال ۱۳ :۔ مسلم لیگ کی مجلسِ عمل کی جانب سے حسبِ ذیل سوال نامہ بھیجا گیا ہے:

کن اصول خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی اصلاح، ان حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں، اسلامی اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہ کرم حسبِ ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے:۔

(۱) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی احیاء کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارسِ فکر کو متحد اور مربوط کیا جا سکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجیے جو اصولِ اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انھیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر وہ جیسی آزاد ریاستیں حاصل کریں جن میں ان کی اکثریت ہو، تو ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کر سکیں جس میں مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خوش آیند ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(س) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔

جواب:۔ آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزا ہیں۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنھیں بنانا قرآن کا اصل منشا رہا تھا۔ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ انسان سے اس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انھوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مدارات و مصالحت (Compromise) اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اصول پر جو پارٹی کام کرے گی اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آئے ہیں اول تو سرے سے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوئے بھی تو وہ اس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آئے ہیں۔ انھیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی، بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنی ہوگی جس سے بنی ہوئی اسکیم کو نافذ کر سکیں۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پا سکیں اور وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے ننانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل، اور پچانوے فی صدی منحرف، اور نوے فی صدی انحراف پر مصر ہیں، یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اس منشا کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا

ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اس پورے مجموعہ کو جو اس وقت عملاً قائم ہے، تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں لیکن پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کچھ نہ پا سکیں گے۔

سوال ۲:۔ آپ کو علم ہوگا کہ مسلم لیگ نے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مجلس عمل کا تقرر کیا ہے۔ پھر اس مجلس عمل نے مختلف ذیلی مجالس مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ انہی میں سے ایک مذہبی و معاشرتی حالات کی اصلاح کے لیے ہے جس کے داعی کی طرف سے آپ کو ایک سوال نامہ غالباً موصول ہو چکا ہوگا[1]۔ اس سوال نامہ کو خاص توجہ کا مستحق سمجھیے اور ہر طرح کے اختلافات کو نظر انداز کر کے فکری تعاون فرمائیے۔ غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ابھی تک مسلمانوں نے اپنی ہمیت کو مغربی سیلاب الحاد کے مقابلہ میں بچا رکھا ہے۔ اگر اس نازک لمحہ میں ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو ممکن ہے کہ نوجوان بلست ترکی اور ایران کے نقش قدم پر چل نکلیں۔

جواب:۔ آپ کا عنایت نامہ آنے سے پہلے ہی میں لیگ کی مجلس عمل کو متذکرہ سوال نامہ کا جواب دے چکا ہوں۔ آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا بلکہ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حصہ لوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر (Half measures) میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں اور نہ داغ دوزی (Patch work) سے مجھ کو کبھی دلچسپی رہی ہے۔ مگر جو چیز مجلس عمل کے پیش نظر ہے وہ یہی کچھ ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیش نظر ہوتی تو میں بدل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا، لیکن یہاں کل کو بجنسہٖ برقرار رکھتے ہوئے اس کے بعض اجزا کو ہٹا کر ان کی جگہ بعض دوسرے اجزا لا رکھنا مطلوب ہے جس کے لیے کوئی قابل عمل اور نتیجہ خیز صورت سوچنے سے میرا ذہن عاجز ہے۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع انھوں نے اس طریقہ سے کوئی بہتر نتیجہ نکال کر دکھا دیا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں مسلک کلی سے مسلک جزئی کی طرف منتقل (Convert) ہو جاؤں۔

پاکستان

سوال:۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ تمام عالم کو قانونِ الٰہیہ کے آگے مفتوح کرے۔

لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ! — تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابل اعتراض نہیں؟

یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے

[1] یہ وہی سوال نامہ ہے جو اوپر ہمارے جواب سمیت درج ہو چکا ہے۔

بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن ان کے قبضہ میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔

میرے خیال میں مسلمان ـــــ یا بالفاظ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کر کھڑا نہ کر دے گی؟

جواب:- پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے، ان کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں، اب اگر ان کا قومی وطن کہا جا سکتا ہے تو اسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں، بلکہ ان کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لیا یا جائے اور اسے زبردستی ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بعینہٖ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انھیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کریں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ البتہ ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی اور علمبردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک قوم ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطہ میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظام اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

لاہور میں ہماری مطبوعات ملنے کا پتہ

مکتبہ اسلامی ـ ۲۳ ـ ربانی روڈ ـ پرانی انارکلی ـــــــــ لاہور